تذکرہ سید مودودی: ۲'۳

ایک مطالعہ

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ٥

بیسویں صدی کا سورج طویل مسافت طے کرنے کے بعد، غروب ہونے والا ہے۔

ایک سو سال کے سفر میں اس نے کیا کچھ نہیں دیکھا: قوموں کا عروج و زوال' تحریکوں کا نشیب و فراز' شخصیات کی آمد و رفت' نظریات کی آویزش و کش مکش' دو عظیم جنگوں اور بعض انقلابات کے نتیجے میں بے مثال خون ریزی و غارت گری' ہجرتیں اور انسانیت کی تباہی و بربادی وغیرہ------ رواں صدی اس اعتبار سے منفرد ہے کہ چشم فلک نے اتنے قلیل عرصے میں' بساط عالم میں رونما ہونے والی' ایسی بڑی تبدیلیاں اور اتنی کثیر تعداد میں انقلابات' کم ہی دیکھے ہوں گے۔

تاریخ میں شاید ہی اتنی بڑی تعداد میں قوموں اور ملکوں کو آزادی نصیب ہوئی ہو گی جس قدر بیسویں صدی میں ملی۔ افریقہ اور ایشیا کے دسیوں خطے برطانوی' فرانسیسی' ولندیزی' پرتگالی اور روسی سامراج سے آزاد ہوئے' مگر تاریخ کے اورق الٹتے ہوئے' قاری رہ رہ کر ایک گہرے تاسف سے دوچار ہوتا ہے اور وہ یہ کہ یہ ظاہری آزادی ان اقوام کی حقیقی آزادی کا پیش خیمہ نہ بن سکی۔ سیاسی طور پر تو انھیں آزادی مل گئی مگر ذہن بدستور غلام رہے۔ اس ذہنی غلامی کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ دوسروں کی طرح' ہم برعظیم کے مسلمان بھی ابھی تک اس سے نجات نہیں پا سکے۔

ذہنی غلامی کے دور رس اور گہرے اثرات کا حقیقی ادراک بیسویں صدی میں جن مسلم اکابر نے کیا' ان میں علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷ـ۱۹۳۸) اور مولانا مودودیؒ (۱۹۰۳ـ۷۹) کے نام سرفہرست ہیں۔ ذہنی غلامی کے خاتمے کے بغیر کسی مثبت' تعمیری اور نتیجہ خیز تحریک کا ثمر آور ہونا ممکن نہیں ہے' اس لیے دونوں کی زندگیاں اسی کے خلاف جدوجہد کرتے گزریں۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ کا زمانہ' اسلامی نشات ثانیہ

---

٥ استاد شعبہ اردو' پنجاب یونی ورسٹی' اورینٹل کالج' لاہور

کی آرزومندی اور اس کے لیے عملی جدوجہد کے لیے حد درجہ ناسازگار تھا۔ ۶۰' ۷۰ سال کا طویل عرصہ گزر جانے پر' آج ہمارے لیے ان حالات کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ گو' علامہ اقبال ؒ ایک گہرے ایمانی شعور و جذبے اور تیقن کے ساتھ کہہ رہے تھے:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

بایں ہمہ' عوام الناس تو کجا' ہندستان کا جدید اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ذہنی غلامی سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ اس کا اندازہ مولانا مودودیؒ کے ایک دیرینہ قریبی رفیق اور درویش صفت عالم ملک غلام علی مرحوم (وفات: ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴) کے روایت کردہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں ملک صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ مولانا مودودیؒ نے وہاں اعزازی طور پر اسلامیات کا درس دینا شروع کیا تو [ملک صاحب بتاتے ہیں کہ] : ان کی تقاریر سننے کے بعد' میرے قلب و ذہن کی دنیا بدل گئی اور میں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ میرے اساتذہ کو علم ہوا تو اظہار افسوس کرنے لگے اور مجھے بلا بھیجا۔ پروفیسر حمید احمد خاں احساس ملی سے سرشار ایک فاضل دانش ور تھے۔ ایک طرف تو وہ خود کو مولانا مودودیؒ کا مداح قرار دیتے تھے مگر دوسری طرف مولانا کی جدوجہد' ان کے نزدیک ایک کار عبث تھی۔ چنانچہ وہ ملک صاحب کو سمجھانے لگے اور ان سے کہا: He is fighting for a lost cause (وہ [مودودی] ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں)۔ اسی طرح ملک صاحب کے ایک اور استاد ڈاکٹر سعید اللہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ مولانا مودودیؒ کی دعوت "ویرانے میں چیخ پکار" کے مترادف ہے۔ انھوں نے ملک صاحب سے کہا تھا: That is a cry in the wilderness

خیال رہے کہ یہ اساتذہ مسلمانوں کے ایک بڑے ملی' تعلیمی ادارے اسلامیہ کالج [ریلوے روڈ] سے منسلک تھے' قومی جذبہ رکھنے والے دردمند مسلمان تھے اور علامہ اقبالؒ کے ہاں حاضرباش لوگوں میں سے تھے۔ مگر تعجب ہے کہ اقبالؒ کی انقلاب انگیز شاعری اور ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے باوجود یہ حضرات اسلامی نشات ثانیہ کے لیے مولانا مودودیؒ کی مساعی کو ایک کار لاحاصل سمجھتے تھے۔

بلاشبہ مولانا مودودیؒ نے حد درجہ ناسازگار' اور بڑی حد تک حوصلہ شکن اور مخالفانہ ماحول میں کام کا آغاز کیا۔ یہ ان کی نیک نیتی' خلوص' دردمندی اور محنت و لگن اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا کہ ان کی جلائی ہوئی مشعل' بہ قول اقبالؒ : "بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی" ثابت ہوئی جس نے اِدھر اُدھر بھٹکنے والوں کو ایک راستہ دکھایا' لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ آغاز کار میں وہ تنہا تھے لیکن رفتہ رفتہ رازدانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور آج' ان کی وفات کے صرف ربع صدی بعد ان کی فکر اور ان کی آغاز کردہ تحریک اسلامی کے ہمہ گیر اثرات کو' کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے' پوری دنیا میں دیکھا جا

سکتا ہے:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

مغرب اور اسلام کے درمیان ایک آویزش اور دنیا پر مکمل غلبے کے لیے امریکہ کی حالیہ مجنونانہ کوششوں اور مختلف الاطراف مزاحمت کے پس پردہ' کسی نہ کسی درجے میں مولانا مودودیؒ کے اثرات سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مولانا مودودیؒ کون تھے؟--- ان کی شخصیت کیسی تھی؟--- اس کے عناصر' ان کا دعوتی طریقۂ کار' حکمت عملی' ان کی عزیمت' ان کے رفقا' ان کی تحریک کے اہداف' نشیب و فراز اور مجموعی حیثیت سے تقریباً پون صدی کی جاں گسل اور تاریخ ساز جدوجہد کی کہانی' ہمیں حال ہی میں شائع ہونے والے دو ضخیم مجموعوں **تذکرہ سید مودودی** (حصہ دوم اور سوم) میں ملتی ہے۔ ایک ایسی کہانی اور ایک ایسی داستان جو دلچسپ ہونے کے ساتھ سبق آموز بھی ہے اور جسارت آفریں اور جرأت انگیز بھی۔ یہ ہماری ملی تاریخ کا حصہ ہے۔ ایسی تاریخ' جو محض کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہو کر رہ جانے والی نہیں ہے' بلکہ یہ پر حرارت اور پر گداز لفظوں کا ایسا کارواں ہے' جو تاریخ کے اوراق سے جھانک جھانک کر قارئین سے مکالمہ کرتا اور انھیں عمل پیہم سے کام لینے اور جہاد زندگی میں سرگرم عمل ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ تحریریں بتاتی ہیں کہ وقت کی پکار کیا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یاد رہے کہ ۱۹۸۶ میں **تذکرہ سید مودودی** کا پہلا حصہ (۱۰۰۰ صفحات) شائع ہوا تھا۔ اب اس کا دوسرا حصہ (۸۰۶ صفحات) اور تیسرا حصہ (۹۵۰ صفحات) بہ یک وقت سامنے آئے ہیں جنھیں جناب جمیل احمد رانا اور سلیم منصور خالد نے کمال محنت و کاوش اور دیدہ ریزی سے مرتب اور ادارہ معارف اسلامی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے (قیمت' اول: ۶۰۰ روپے' دوم: ۶۲۵ روپے)۔

تذکرہ سید مودودی مختلف النوع تحریروں پر مشتمل ہے: مقالات' مصاحبے (انٹرویو)' تاثرات' نوادرات اور کتابیات وغیرہ وغیرہ۔ بڑی تقطیع کے تقریباً دو ہزار صفحات میں' قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں' کیا کچھ نہیں ہو گا۔

لکھنے والوں میں پروفیسر خورشید احمد' ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری' خرم مراد' اے کے بروہی' الطاف گوہر' مولانا محمد ناظم ندوی' نعیم صدیقی' پروفیسر سید محمد سلیم' چودھری غلام جیلانی' خان محمد ربانی' ڈاکٹر تحسین فراقی' سید فضل معبود' ڈاکٹر سفیر اختر' شیخ عبدالمالک' مولانا جلیل احسن ندوی' مولانا خلیل احمد حامدی' حافظ محمد

ادریس، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، حکیم محمد سعید، شیخ علی طنطاوی، سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر ابن فرید، جان محمد بھٹو، اعجاز الحق قدوسی اور بہت سے دوسرے اہل قلم شامل ہیں۔ چودھری غلام محمد کی "تاریخ جماعت اسلامی" ایک مکمل اور مفصل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح پروفیسر غلام اعظم کا مضمون "مولانا مودودیؒ شخصیت اور کارنامے" (۲: ۶۳۵-۶۷۴) خواجہ اقبال احمد ندوی کا طویل مضمون "مولانا مودودیؒ: رفاقت اور مشاہدات" (۳: ۸۲۵ - ۹۳۲) مکمل کتابوں کی طرح ہیں۔ میاں طفیل محمد صاحب سے مصاحبہ (۳: ۱۷-۱۷۷) ایک معرکے کی چیز ہے جس میں مولانا مودودیؒ کی شخصیت، جماعت اسلامی کی تاریخ، اس کی دستوری جدوجہد، پاکستان کا ۵۰ سالہ منظرنامہ، اور خود میاں صاحب کی اپنی شخصیت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بعض کلیدی نکات سامنے آتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ بلاشبہ ایک نابغہ روزگار شخص تھے۔ معاصرت کی دھند چھٹے گی تو ان کی عظیم شخصیت کے دل کش و دل نواز نقوش اور واضح ہوں گے۔ زیر نظر مجلّے میں اس کی متعدد جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے رفقا میں سے میاں طفیل محمد صاحب کو، غالباً ان کی سب سے طویل اور قریب ترین رفاقت حاصل رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری نگاہ میں مولانا مودودیؒ اس زمانے میں خدا کی زمین پر اسلام کا ایک چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ اپنے اخلاق میں، عادات میں، معاملات میں، اپنے ظاہر و باطن میں وہ اسلام کا عملی اظہار تھے۔ مولانا مودودیؒ سے واسطہ پڑنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ واقعی امت محمدؐ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، ہوسکتے ہیں اور اب بھی ہیں کہ جنھوں نے شہادت حق کے اس فریضے کو اپنی حد تک اسی طرح انجام دینے کی پوری کوشش کی جس طرح سے نبیؐ نے امت کے سپرد فرمایا (۳: ۱۱۷)۔

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد، مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے بارے میں، مسلم لیگ کا طرز عمل بہت عجیب و غریب رہا ہے، بایں ہمہ انصاف پسند مسلم لیگی حضرات، مولانا کے عظمت کردار کے ہمیشہ قائل رہے بلکہ اس کا اعتراف کرنے میں بھی انھوں نے کبھی تامل نہیں کیا۔ کنور شفیق اللہ صاحب کانگڑہ کی ضلعی مسلم لیگ کے صدر اور پنجاب کی صوبائی کونسل کے ممبر تھے۔ قرارداد پاکستان کے جلسے (۲۳ مارچ ۱۹۴۰) میں بھی شریک رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ: اپنے دینی پس منظر کی وجہ سے، میں غلبہ اسلام کے نام پر اٹھنے والی ہر تحریک کی جانب لپکتا رہا، مگر مایوسی ہوتی رہی۔ علامہ مشرقی اور غلام احمد پرویز کا اسیر رہا، مگر قریبی مشاہدے نے ان کی جانب سے دل کھٹا کر دیا، پھر جماعت اسلامی کی طرف راغب ہوا، مگر رائے قائم کرنے میں بہت محتاط رہا۔ جب میں نے جماعت اور اس کے تربیت یافتہ افراد اور قیادت کے کردار کا اچھی طرح مشاہدہ کر لیا اور اطمینان ہو گیا کہ ان کے گفتار و عمل میں کوئی تضاد نہیں، تو میں بالکل یکسو ہو گیا اور یہ وہ موقع تھا کہ جب بڑے بڑے متقیوں کے ایمان متزلزل اور کردار ڈانواں ڈول ہو گئے تھے....

قیام پاکستان کے بعد مجھے لاہور میں افسر بحالیات مقرر کر دیا گیا۔ ان دنوں افسر بحالیات ہی آخری اتھارٹی ہوا کرتا تھا، وہ جو کر دے، حتمی ہے۔ میرے ذمے مہاجرین کو مکانات اور دکانیں الاٹ کرنا تھا۔ بعض دکانیں بھری پڑی تھیں اور میں اس امر کا مجاز تھا کہ انھیں لونڈ قرار دے کر کسی کو الاٹ کر دوں، خواہ اندر پانچ لاکھ کا مال ہی کیوں نہ پڑا ہو۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مولانا میں اس وقت الحمدللہ ایک افسر ہوں۔ جماعت سے تعلق رکھنے والے جتنے بھی مہاجر افراد ہیں آپ انھیں میرے پاس بھیجتے جائیں۔ میں انھیں اچھے کاروباری مراکز میں دو دکانیں الاٹ کر دوں گا، اس کے علاوہ بھی کوئی خدمت میرے لائق ہو، بلاتکلف مجھے بتائیں، مجھے آپ کی خدمت کر کے مسرت ہوگی۔ مولانا نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مختصر سا جواب دیا: ''ضرورت پیش آئی تو میں آپ کو زحمت دوں گا''۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہر آدمی ضرورت مند تھا۔ بڑے بڑے لوگ، اب نام کیا لینا، میرے دفتر کا طواف کرتے تھے، سفارشیں لے کر آتے تھے۔ یہ سفارش کرنے والے بھی مسلم لیگ کے بڑے لوگ تھے جو اپنے عزیز و اقارب، احباب وغیرہ کے لیے بلا کسی ادنیٰ تمیز کے، کہ وہ مستحق ہے یا نہیں، سفارشیں کیا کرتے تھے، لیکن میں نے صرف مولانا مودودیؒ ہی کو ایک ایسا شخص پایا جنھوں نے نہ اپنے لیے کچھ مانگا نہ اپنے رفقا کے لیے۔ ہاں، یاد آیا ایک آدمی میرے پاس مولانا کا دو سطری رقعہ لے کر ضرور آیا جس کا مضمون بس اتنا تھا کہ ''یہ صاحب دہلی میں میرے ہمسائے تھے، ان کی وہاں دکان تھی، اگر ان کے لیے آپ کچھ کر سکیں تو حق دار کو اس کا حق مل جائے گا۔ فقط ابوالاعلیٰ'' (۲:۴۳۱)۔

مولانا مودودیؒ کی سوانح میں ان کی جرأت و عزیمت کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ایک واقعہ میاں طفیل محمد صاحب نے سنایا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۵۳ کے مارشل لا میں جب مولانا کو قادیانی مسئلہ لکھنے کے جرم میں سزاے موت سنائی گئی، تو متعلقہ فوجی افسر نے کہا: آپ چاہیں تو اپنی سزا کے خلاف سات دن کے اندر کمانڈر ان چیف سے رحم کی اپیل کر سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی، مولانا کا چہرہ بلامبالغہ انگارے کی مانند تمتما اٹھا اور آپ نے نہایت باوقار لہجے میں جواب دیا:

> مجھے کسی سے کوئی اپیل نہیں کرنی ہے۔ زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی اور اگر وہاں میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا، تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی (۳: ۵۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت ایک ایسے گہرے دریا کی مانند نظر آتی ہے، جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے: ''تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں''۔ ایک ایسا گہرا اور پرسکون دریا، جو ایک معتدل رفتار سے مگر بڑی روانی کے ساتھ بہے چلا جا رہا ہے۔ مولانا اپنی طبیعت کے اضطراب، فکرمندی، پریشانی اور صدموں کو بالعموم دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کے چہرے پر غصے یا جھلاہٹ کے آثار کم ہی

دکھائی دیتے۔ انتہائی پریشان کن حالات اور صدمہ انگیز موقعوں پر بھی، وہ بالعموم پرسکون رہتے۔ بلا کے متحمل مزاج تھے۔ قریبی عزیزوں کی موت پر بھی انھیں روتے نہیں دیکھا گیا۔ بیگم مودودیؒ نے انھیں ایسے سمندر کی مانند قرار دیا جو کبھی متلاطم نہیں ہوتا (۳: ۱۷۸۔ ۲۱۰)۔ مزید برآں بیگم مودودی اور ان کی بیٹی حمیرا (۲: ۴۳۷۔۴۴۸) کے مصاحبوں (انٹرویو) سے بھی ان کی شخصیت کے بعض ایسے نادر پہلو منکشف ہوتے ہیں جن تک رسائی شاید اور ذریعے سے ممکن نہ تھی، مثلاً: ان کا حکیمانہ مزاج، عملی زندگی میں ان کی حکمت عملی کے بعض پہلو، اہل خانہ اور بچوں سے محبت، انتہائی مشفقانہ طرزِ عمل، ناز برداری کی حد تک اہل و عیال کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال اور حتی المقدور انھیں پورا کرنے کی کوشش۔ حمیرا مودودی کے بہ قول: "بلامبالغہ وہ اپنے بچوں کی اتنی عزت کیا کرتے تھے، جتنی دوسرے لوگ ماں باپ کی کرتے ہیں"۔ بیگم مودودی کے انٹرویو سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے مقصد زندگی کی خاطر اپنی صحت کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تحریک ختم نبوتؐ میں گرفتار ہوئے تو جیل سے پرانی پیچش اور السر کی بیماریاں لے کر آئے جنھوں نے آخر وقت تک ان کی صحت کو متاثر رکھا۔ شدید محنت اور رت جگوں نے، ان کی بیگم کے بہ قول، ان کی ہڈیاں تک گھلا ڈالیں، حالانکہ ان کی صحت ایسی قابل رشک تھی کہ انھیں کبھی بخار تک نہ ہوا تھا۔

اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ ہمارا سب سے بڑا المیہ کیا ہے؟ تو اس کا صحیح جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم حصول پاکستان کا مقصد پورا نہیں کر سکے۔ وجوہ تو بہت ہیں، مگر یہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ارباب اقتدار و اختیار (الا ماشاء اللہ) اپنے اوپر اسلام نافذ کرنے والے نہ تھے۔ یہی چیز مسلم لیگ پر مولانا کی تنقید کا سبب بنی تھی۔ کنور شفیق اللہ راوی ہیں کہ مولانا نے ایک موقع پر اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے اس بات میں شک ہے کہ وہ لوگ جنھیں خود اسلام کے بارے میں شرح صدر حاصل نہیں، جو اسلام اور اسلامی نظام کی ابجد سے بھی واقف نہیں، جس جماعت کی قیادت اور صفوں میں کمیونسٹ بھی موجود ہیں، اور قادیانی بھی، وہ اسلام کیسے نافذ کر سکیں گے؟ مجھے تو یوں نظر آ رہا ہے کہ مسلم لیگ کی صفوں میں، جو چند علما نظر آ رہے ہیں، اتنی بڑی بھیڑ میں ان کی آواز اس وقت کوئی نہیں سنے گا" (۲: ۴۲۶)۔ اس سلسلے میں مولانا نے مزید کہا:

میرا گمان یہ ہے کہ چونکہ ملک کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں ہو گی کہ جن کی عملی زندگیوں کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں، اس لیے اسلامی نظام حیات انھیں اپنے لیے گلے کا پھندا نظر آئے گا۔ "چنانچہ وہ اس پھندے سے دور رہنے اور دور رکھنے میں ہی عافیت سمجھیں گے اور اس بات پر مصر ہوں گے کہ اسلام بس وہی کچھ ہے کہ جو وہ سمجھتے ہیں اور یہ کہ مذہب انفرادی معاملہ ہے، اس کا

نظام حکومت سے کوئی سروکار نہیں۔ اب اگر کسی نے یہ یاد دلانے کی کوشش کی کہ آپ نے تو یہ خطہ اسلامی نظام قائم کرنے کے وعدے پر لیا تھا اس لیے یہاں پر اسلامی نظام ہی قائم ہونا چاہیے تو وہ ایسے شخص کو پس دیوار زنداں ہی نہیں، ٹکٹکی پر لٹکانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے (۲:۷-۴۲)۔

کنور شفیق اللہ کہتے ہیں کہ مولانا کی گفتگو سے میں گومگو کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا' قرائن ان کی باتوں کی تصدیق کرتے تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میری تشفی نہیں ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا کی یہ باتیں' قیام پاکستان کے بعد حقیقت ثابت ہوئیں۔

دراصل قیام پاکستان کے مقاصد سے انحراف' ہمارے رہنماؤں کی کوئی نادانستہ غلطی نہیں' بلکہ ایک شعوری حرکت تھی۔ جاگیردارانہ پس منظر رکھنے والی قیادت پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنانے کے لیے آمادہ نہ تھی اور افسرشاہی سے انھیں اس کی تائید مل گئی۔ جناب الطاف گوہر بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں ہمارے سینیر افسر' مولانا مودودیؒ کو ایک ایسا اچھا قلم کار اور ایک قابل ذکر مفکر سمجھتے تھے جو "سیاسی مقاصد کے لیے غریب مذہب کو ایکسپلائٹ کر رہا تھا" (۲:۸۰)۔ ان کے خیال میں اسلام کو مساجد اور مسلمانوں کے شخصی معاملات تک محدود رہنا چاہیے۔ قرآن ذاتی زندگی کے لیے بہت اچھا تھا' لیکن ریاست کے معاملات اور انتظام میں شریعت کے لیے کوئی گنجایش نہیں تھی۔ اجتماعی زندگی کو مغربی اداروں اور قوانین ہی کی ذمہ داری رہنے دی جائے۔ حکومت کو برطانوی طرز کے اداروں کی حدود میں کام کرنا چاہیے--- "مولانا مودودیؒ ایک کنفیوزڈ [پریشان خیال] شخص ہے اور نئی ریاست کے لیے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ اگر یہ دشمن نہیں تو دشمن کا ایجنٹ ضرور ہے" (۲:۸۱)۔

اس پس منظر میں پاکستان پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ قرارداد مقاصد پاس ہوئی' پاکستان اسلامی جمہوریہ قرار پایا اور دستوری اور اصولی طور پر اسے ایک "اسلامی ریاست" تسلیم کر لیا گیا [نہ کہ بہت سے مسلمان ملکوں کی طرح "سیکولر جمہوریہ"] ۔ اس ضمن میں مولانا مودودیؒ اور ان کی اسلامی تحریک کی خدمات اور کاوشیں اظہر من الشمس ہیں اور ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا مودودیؒ کے مخالفین کی طرف سے ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے' مثلاً یہ کہ انھیں امریکہ سے امداد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں میاں صاحب بتاتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک زوروں پر تھی تو غلام غوث ہزاروی اور قادیانی حلقوں کی طرف سے اس الزام کی لہر ایک بار پھر اٹھائی گئی۔ میرے بیٹے محسن فاروق کا ایک ہم جماعت لڑکا' کئی ماہ تک پابندی سے بہ ظاہر محسن کا گہرا دوست بنا رہا اور ہمارے گھر آتا رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑے قادیانی کا صاحبزادہ ہے اور اسے جاسوسی کی ڈیوٹی پر مامور کیا گیا ہے کہ امریکی امداد کا کوئی سراغ لگانے اور ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ پتا چلا کہ اس لڑکے نے اپنے مرکز کو یہ رپورٹ دی کہ اگر ان لوگوں کو کہیں سے کوئی امداد

ملتی ہے تو وہ اسے ایندھن کے طور پر استعمال کر لیتے ہوں گے اور ڈالر چولھے میں ہی جلا دیتے ہوں گے کیونکہ ان کے کھانے پینے' پہناوے یا زندگی کی کسی بھی آسایش میں تو اس کا کوئی نشان نہیں ملتا' بلکہ یہ لوگ عسرت سے زندگی بسر کرتے ہیں (۳ : ۱۲۴)۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوتا ہے کہ کیا پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟ کے نام سے پروین رضوی کا جو کتابچہ ملتا ہے' وہ دراصل مولانا مودودیؒ کا تحریر کردہ ہے (۲: ۳۵۷)۔

مولانا مودودیؒ کی سیاسی جدوجہد' ان کی دینی خدمات اور تفسیر قرآن کو تو خاصا سراہا گیا مگر ان کے تصنیفی و تالیفی اور علمی کارنامے کے صحیح تعین قدر کی طرف سنجیدگی سے کم توجہ دی گئی ہے' حالانکہ مولانا مودودیؒ کی تصانیف میں جو تنوع اور جامعیت ہے' اس کی مثال بیسویں صدی کے کسی اور دینی ادیب کے ہاں نہیں ملتی (سیاسیات' قانون' تاریخ' تہذیب' معاشیات' عمرانیات' فقہ' حدیث اور قرآن وغیرہ)۔ مولانا کے اسلوب کا تجزیہ بھی کم ہی کیا گیا ہے۔ زیر نظر تذکرہ کا یہ ایک امتیازی پہلو ہے کہ اس سے مولانا مودودیؒ بیسویں صدی کے ایک منفرد اور بے مثل ادیب اور مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جناب خرم مرادؒ نے "ایک ایمان افروز کتاب" کے طور پر خطبات کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ مولانا کی کسی تصنیف کے تجزیاتی مطالعے کی پہلی سنجیدہ کوشش ہے جس سے خطبات کی قدر و قیمت' تبلیغ دین میں اس کی اہمیت' اس کے انداز بیان کی دل کشی' تاثیر' اور اس کا سادہ و بامعنی اور پرزور طرز ابلاغ (ایک واضح اور استدلالی جذبے کی حدت' منطق' نفسیات اور اس کے اندر تقابل کا آہنگ) واضح ہوتا ہے۔

جناب اے کے بروہی نے بھی مولانا مودودیؒ کے اسلوب نثر کی طرف اہم اشارے کیے ہیں اور ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے قابل قدر مضمون میں مولانا کی نثر اور ان کی علمی و ادبی حیثیت پر کام کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے (۳: ۵۹۴-۶۰۱) [مگر اسی موضوع پر فاروق اعظم کا مضمون سرسری اور معیار سے فروتر ہے]۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ اردو کے سب سے مقبول' اور اس اعتبار سے بڑے مصنف ہیں۔ ان کے تصنیفی کارنامے کے ضمن میں راقم الحروف نے تصانیف مودودیؒ کا ایک کتابیاتی اور اشاعتی مطالعہ پیش کیا ہے' جس میں متن کے تعین کے ساتھ ان کی جملہ تصانیف (complete works) کی بہ وضاحت نشان دہی کی کوشش کی گئی ہے۔ زیادہ تر تحریروں کا زمانۂ تحریر اور زمانۂ اشاعت بھی متعین کیا گیا ہے۔ اس مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کے خیالات' مناسب غور و فکر اور تیاری کے بعد ہی تحریر و تصنیف کا روپ اختیار کرتے تھے۔ پھر وہ ہمیشہ اپنی تحریروں پر نظرثانی کا عمل جاری رکھتے تھے اور ان میں ترامیم کرتے رہتے تھے۔ دونوں جلدوں کے آخر میں مولانا کے دست نوشت مسودات کے بعض حصے شامل کیے گئے ہیں (میرے خیال میں hand - written کا ترجمہ "خطی عکس" کے بجائے "دست نوشت" بہتر ہے)۔ ان سے مولانا کی

محنت شاقہ کی عادت ظاہر ہوتی ہے، مثلاً: ابتدائی زمانے میں قوم، قومیت اور قوم پرستی پر مغربی تصورات کا ایک خلاصہ جو Encyclopedia of Religion and Ethics سے اخذ کیا گیا، اپنے بعض مسودات میں ترمیم و تصحیح اور بعض پبلک تقریروں کے خاکے، اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فی البدیہہ تیار کیے گئے۔ مختلف اردو اور انگریزی کتابوں پر محمد یوسف صاحب نے مولانا کے جو دیباچے اور تقریظات جمع کی ہیں (۲:۳۱۷ تا ۷۵۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا موصوف لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں فیاض واقع ہوئے تھے مگر ان کی رائے بہت محتاط ہوتی تھی۔

یہ سب چیزیں مولانا کی منظم اور منضبط شخصیت کا پتا دیتی ہیں۔

تذکرہ کی زیر نظر دونوں جلدیں، مولانا مودودیؒ، میاں طفیل محمد اور جماعت کے بہت سے مرحومین (بالخصوص مولانا امین احسن اصلاحی) دینی جماعتوں، سیاسی گروہوں، پاکستان میں دین اور لادینیت کی کش مکش، مسلم لیگ، جاہ طلب اور اقتدار پرست افراد اور گروہوں کے آمرانہ اقدامات اور محلاتی سازشوں، غرض برعظیم کی تقریباً ایک صدی کی دینی، تہذیبی، علمی اور سیاسی تاریخ کا ایک جامع مرقع اور خزینہ معلومات ہے۔ کہیں کہیں متن پر مفید اور معلومات افزا حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کاش جمیل احمد رانا، حواشی کا اور زیادہ، اہتمام کرتے۔

مرتبین نے مواد و لوازمہ جمع کرنے میں جو مشقت اٹھائی، اس کا اندازہ، دونوں جلدوں کے بہ غور مطالعے کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۱ میں جس جماعت کی بنیاد ڈالی تھی، اپنی ۶۰ سالہ زندگی میں اب وہ ایک ہمہ گیر اور موثر تحریک بن چکی ہے اور اس کے اثرات پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ تحریکوں میں وسعت اور پھیلاؤ کے نتیجے میں متعدد مسائل پیدا ہوتے ہیں اور کچھ کمی کوتاہی بھی فطری ہے۔ اب اس مرحلے پر تحریک اسلامی کو بیدار و ہشیار اور صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار و مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ کی ہدایات اور اُن کے رفقا کے خیالات سے ہمیں خاصی رہنمائی ملتی ہے۔ ذیل میں ہم تذکرہ کے مطالعے سے اخذ کردہ، چند نکات پیش کر رہے ہیں:

○ اقامت دین یا اسلامی انقلاب دو چار یا دس بارہ سال کا کام نہیں بلکہ ایک صبر آزما طویل مجاہدہ ہے۔ بانی جماعتؒ نے ابتدا ہی میں واضح کر دیا تھا کہ میں کھجور کا درخت لگا رہا ہوں، یہ تیسری، چوتھی، پانچویں نسل میں جا کر، پھل دے گا۔ ظاہر ہے ہزار بارہ سو برس کا انحطاط، دس بیس برس میں تو دور نہیں ہو جائے گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جب تک آپ لوگوں کے ذہن تبدیل (convert) نہ کریں اس وقت تک نہ صحیح معنوں میں کوئی انقلاب لایا جا سکتا ہے اور نہ وہ دیرپا ہو سکتا ہے (میاں طفیل محمد، ۳:۲۶۱، ۲۶۲)۔

○ اسلام کے فکری پہلوؤں پر، خصوصاً جدید نظریات اور معاصر فتنوں کے حوالے سے ٹھوس علمی و تحقیقی کام، خاطر خواہ توجہ چاہتا ہے۔ مولانا اس سلسلے میں بہت فکر مند تھے اور انھیں یہ اندیشہ تھا کہ "میرا یہ سلسلہ، میرے ساتھ ہی قبر میں چلا جائے گا" (شیخ محبوب علی، ۳: ۲۱۸)۔ شاید اس لیے کہ اس تحقیق و تصنیف کے لیے مردان کار بہت کم ہیں۔ جو گنے چنے لکھنے والے ہیں، مولانا مودودیؒ کو شکایت تھی کہ ان کا مطالعہ، خام اور ادھورا ہوتا ہے (مولانا محمد ناظم ندوی، ۳: ۲۴۹)۔ فکر مندی کی بات یہ ہے کہ ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ کے طرز پر، پاکستان میں کوئی تربیتی اور تصنیفی ادارہ قائم نہیں ہو سکا۔

○ میاں طفیل محمد صاحب کی یہ تجویز اہم ہے کہ حیات جاوید اور حیات شبلی کی طرح "حیات مودودیؒ" کی تالیف کا کام بھی ضرور ہونا چاہیے (یہ بات اطمینان بخش ہے کہ معروف مورخ اور محقق جناب آباد شاہ پوری ادارہ معارف اسلامی، لاہور کے تحت یہ کام کر رہے ہیں)۔ "یہ ہم پر گویا ایک قسم کا قرض ہے" (۳: ۲۳۵)۔ سوانح کے ساتھ ایک جامع "کتابیات مودودیؒ" کی تیاری بھی علمی ضرورت ہے۔ بہ حوالہ ۳: ۶۳۶، "تصانیف مودودیؒ" کے اشاعتی اور کتابیاتی مطالعے کو مزید آگے بڑھانا چاہیے۔ اس ضمن میں جناب نعیم صدیقی کے نکات بھی قابل غور ہیں جن پر کام کے لیے "ایثار پیشہ عزیمت مندوں" کی ضرورت ہے (۳: ۳۶۲)۔ راقم کا خیال ہے کہ کوئی صاحب خیر اور صاحب احساس، "مودودیؒ اکیڈمی" کا ڈول ڈال سکیں تو اس نوع کے مزید منصوبے بھی تیار اور تکمیل پذیر ہو سکیں گے۔

○ مولانا مودودیؒ نے شخصیت پرستی کی حوصلہ شکنی کی اور تحریک اسلامی کا مجموعی مزاج بھی یہی رہا ہے، مگر شخصیات کی یاد تازہ رہے تو یہ چیز مزید کاموں کے لیے ایک محرک بھی بنتی ہے۔ ایک عرصے سے راقم کے ذہن میں ایک تجویز ہے: کیوں نہ ایک حفاظت خانہ (آرکائیوز) قائم کیا جائے جس میں ریڈیو اور ٹی وی میں محفوظ مولانا کے بیانات اور مصاحبوں پر مشتمل آڈیو اور وڈیو، ۲۶، ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ کو ریڈیو پاکستان لاہور کے سفر آخرت کا رواں احوال (کمنٹری) اور اسی طرح کی مزید سمعی و بصری یادداشتیں محفوظ کر لی جائیں (ڈاکٹر ابن فرید، ۳: ۵۹۷)۔ زیر نظر دونوں جلدوں کے آخر میں بعض قدیم انتخابی پوسٹروں کے عکس چھاپے گئے ہیں۔ "دارالاسلام" پٹھان کوٹ کی عمارات کے باقیات کی چند تصاویر بھی شامل ہیں۔ مزید برآں مولانا کے بعض دست نوشت صفحات، چودھری رحمت علی کا ایک مکتوب بنام شیخ محمد نصیب بیرسٹر اور مولانا امین احسن اصلاحی کا خط بنام مولانا مودودیؒ بھی دیے گئے ہیں۔ اس نوع کی سیکڑوں تصاویر، مسودات، دستاویزات اور نادر چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ قیمتی ورثے کی حیثیت رکھنے والی اس نوع کی بہت سی چیزوں کو مجوزہ بالا آرکائیوز میں جمع کر دینا بڑا کام ہو گا۔

○ جمعیت کے افراد کے بارے میں مولانا فرماتے تھے کہ اپنے جس فیلڈ (میدان کار) میں بھی وہ پڑھ رہے ہیں یا پڑھا رہے ہیں تو اس میں مہارت اور امامت کا درجہ حاصل کریں، نیز اپنا کیریکٹر اسلام کی بنیاد

کے مطابق ڈھالنے اور بنانے کی کوشش کریں۔ مولانا کو کوئی موقع بھی طلبہ سے گفتگو و خطاب کا ملتا تو انھی چیزوں پر خاص طور پر زور دیتے تھے کیوں کہ مقابلہ مغربی افکار، مغرب سے علمی مرعوبیت اور مغربی تہذیب کے نفوذ کا تھا۔ اس لیے ان کا کہنا تھا کہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ان سے بڑھ کر تیاری کرنی چاہیے (شیخ محبوب علی، ۲: ۳۰۶)۔

○ مولانا مرحوم چاہتے تھے کہ جمعیت سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد بھی اپنے احباب سے رابطہ برقرار رہے، وہ جہاں بھی جائیں، ان کا کمٹ منٹ باقی رہے (شیخ محبوب علی، ۲: ۳۱۲)۔

زیر نظر تذکرہ، مولانا مودودیؒ کی نابغہ عصر شخصیت کی جو جھلک دکھاتا ہے بلاشبہ اس سے مولانا سے ہماری محبت بڑھتی ہے اور ان کی عظمت کا احساس بھی فزوں ہوتا ہے، مگر خود مولانا شخصیت پرستی کے قائل نہ تھے اس لیے ان کا اصل اور اہم حوالہ ان کی فکر اور ان کا علمی و تصنیفی کارنامہ ہے۔ یہ فکر اور کارنامہ کیا ہے؟ جناب خرم مرادؒ نے اپنے قابل قدر مضمون "قرآنی پیغام کی ترجمانی: سید مودودیؒ کی زبانی" میں عمدگی کے ساتھ فکر مودودیؒ کی وضاحت کی ہے۔ ان کے خیال میں: "ان کی فکر کوئی نئی فکر نہ تھی، عین ترجمان قرآن تھی۔ اس لیے انھوں نے انتہائی شدت کے ساتھ اس بات کا اہتمام کیا کہ ان کے افکار و آرا پر "فکر مودودیؒ" کی چھاپ نہ لگے۔ ان کے گرد فکر مودودیؒ کے نام سے کوئی مسلک نہ بننے پائے" (۳: ۲۸۵)--- اور یہ کہ: "ان کی سب سے بڑی خدمت، اسلامی فکر کا احیا ہے" (۳: ۲۵۹)۔ آخر میں خرم صاحب (مرحوم) نے بجا طور پر کہا ہے:

> آج ان کی فکر کے صحیح وارث وہی ہو سکتے ہیں، جو ان کی فکری خدمات کی روشنی میں، اجتہاد و فکر سے کام لیں، ماضی کے اسیر نہ ہوں، حال کے مناسب طریقے اختیار کریں اور مستقبل کے نقیب بنیں، ٹھیک جس طرح انھوں نے اپنے زمانے میں کیا (۳: ۲۷۴)۔

یہی فکر مودودیؒ کا حاصل اور یہی مولانا کا پیغام ہے۔ تذکرہ سید مودودی اس فکر اور اس پیغام کو نمایاں اور اجاگر کرنے کی ایک اچھی کوشش ہے، ایک بامعنی اور کامیاب علمی کاوش جس پر مرتبین مبارک باد کے مستحق ہیں اور ادارہ معارف اسلامی اس کی اشاعت پر داد و تحسین کا سزاوار ہے۔ امید ہے ادارہ اسی نوعیت کے مزید علمی منصوبوں کو بروئے کار لانے کا اہتمام کرتا رہے گا۔